Chapter. 9 – conclusion

<u>باب نهم</u>

ماحصل

باب نہم

ماحصل

امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؔ کا شمار ان عہد ساز شخصیتوں میں ہوتا ہے جو فلک کے برسوں گردش کرنے کے بعد پردۂ گیتی پر نمودار ہوتی ہے۔ وہ بیک وقت مجاہد آزادی ،مدبّر سیاست، مفکر و فلسفی، عالم دین، ماہر قرآنیات و حدیث، دانائے تاریخ عالم، سحرالبیان خطیب اور ماہر تعلیم کے علاوہ بے مثل ادیب اور عظیم دانشور بھی تھے ۔انہوں نے زندگی کے ہر دائرے میں اپنے افکار و نظریات سے ایک عالم کو متاثر کیا۔ ان کی مختلف الجہات شخصیت، اپنے غیر معمولی کارناموں سے تاریخ کی پیشانی پر ایسا نقش ثبت کر گئی کہ اقوام عالم کی نظر وتوجہ کامرکز بن گئی۔ ان کی ہمہ گیر شخصیت کے تمام گوناگوں خصائص اور ان کی علمی و ادبی،سیاسی وصحافتی سرگرمیوں کے باوجود انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انسانیت کے اس محسن اعظم کو وہ مقام نہیں دیا گیا جس کا وہ صحیح معنوں میں مستحق تھا۔بد قسمتی سے ان کی بیش بہا تحریروں اور تقریروں کے الفاظ کی معنویت کو ان کی زندگی میں پوری طرح نہیں سمجھا گیا۔جب کہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے قوم و ملت کے مردہ دلوں میں ہمیشہ زندگی کی نئی روح پھونکی ۔ہندوستان کے زوال و انحطاط کے دور میں اس نفس قدسیہ نے حکمت و بصیرت کے ساتھ مشکل حالات کا مقابلہ کیا اور تجدید و احیاء کے راستے تلاش کئے۔ نیز اسلامی معاشرے کے صحیح مزاج کو برقرار رکھنے میں انہوں نے پورے خلوص اور بھرپور جدو جہد سے کام لیا۔

مولانا آزادؔ ایسے خاندان میں پیدا ہوئے تھے جو علم و حدیث کی خدمت وچاکری کی سعادت سے ہر دور میں ممتاز رہا تھا۔ان کے ننھیال اور ددھیال میں تحریر وتقریر ،عبادت و ریاضت،علم و ارشاد، فلسفہ و حکمت، سلوک و طریقت، زہد و تقویٰ اور حق بیانی و جاں فروشی کی ایک مستقل روایت موجود تھی۔ ان کے خاندان میں شیخ محمد افضل، شیخ جمال الدین، مولانا منور الدین، شیخ محمد ہادی اور مولاناکے والد مولوی خیرالدین وغیرہ نے اپنے دور میں علم وادب اور مذہب و ملت کے تعلق سے قابل قدر کارنامے انجام دئے تھے۔ ان کے خاندان میں چونکہ پیری

مریدی کی روایت تھی، اس لئے عوام النّاس میں یہ خاندان معزز و محترم سمجھا جاتا تھا۔ لیکن بنیادی طور پر یہ خاندان تقلید پرست اور قدامت پسند تھا،جو مولانا آزاؔد کے خیال کے مطابق سو برس پہلے کی زندگی بسر کر رہا تھا۔چنانچہ اپنے خاندان کے اس تقلید وجمود کے ماحول سے ان کی طبیعت اچاٹ ہوگئی اور شک وشبہات کے کانٹے ان کے دل میں چبھنے لگے۔لہٰذا وہ علم و حقیقت کی تلاش میں نئے سرمایوں کے حصول میں لگ گئے۔

مولانا آزاؔد اپنے موروثی عقائد سے انحراف واجتہاد کرکے کچھ دنوں تک تشکیک و اضطراب میں مبتلا ہوکر دہریت کے دور سے بھی گذرے۔ ابتدا میں وہ سرسید احمد خان کے جدید مذہبی افکار وخیالات اور ان کی تعقل پسندی سے بھی حد درجہ متاثر ہوئے لیکن ان سے بے پناہ عقیدت کے باوجود مولانا ان کے افکارونظریات سے کلی طور پر متفق و مطمئن نہ ہوسکے۔ آخرش انہوں نے اپنی ہی فکر و بصیرت اور مختلف علوم کے غائر مطالعے سے اپنی منزل کا سراغ لگالیا اور بالآخرانکار والحاد کے مراحل سے گزر کر یقین واعتقاد کی منزل مقصودتک پہنچ گئے۔

مولاناآزاؔد کی ابتدائی زندگی مکہ معظّمہ میں گذری۔ اپنے والد کے ساتھ ہندوستان آنے کے بعد انہوں نے یہاں کے معاصر سیاسی، سماجی اور مذہبی حالات سے واقفیت حاصل کی۔ یہ زمانہ ہندوستان کی غلامی اور برطانوی سامراج کی ستم روانیوں کا زمانہ تھا۔ سماج اور مذہب پر مغربیت کی گرفت مضبوط ہوتی جارہی تھی۔ سرسیداحمدخان کی مصلحت پسند سیاسی پالیسی کے اثرات مسلم طبقے پر غالب تھے۔ مسلمانوں کی بہ نسبت ہندوؤں میں سیاسی بیداری جلدی آگئی تھی اور وہ انگریزوں کے خلاف آزادی کے حصول کے لئے انقلابی کارروائیوں میں مصروف تھے۔ مسلمانوں کی اس سرد مہری اور بے توجہی نے ہندوؤں کی نگاہ میں مسلمانوں کو مشکوک اور مطعون بنا دیا تھا۔ مولاناآزاؔد کی دور رس نظر اور معاملہ فہم ذہن نے اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ جب تک مسلمان جنگ آزادی میں سیاسی اور عملی طور پر شریک نہیں ہونگے تب تک وہ نہ اپنے ہم وطنوں کی نگاہوں میں محترم و معتبر بن سکتے ہیں اور نہ ہی برٹش گورنمنٹ کو ہندوستان کی متحدہ قومیت وقوت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مولانا نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد قائم کرنے اور مسلمانوں میں سیاسی و دینی شعور بیدار کرنے کے مقصد سے اپنا سحر خیز رسالہ "الہلال" (ہفتہ وار) کلکتہ سے ۱۹۱۲ء میں جاری کیا۔ اس سے قبل بھی وہ کئی رسالے نکال چکے تھے اور خاص طور

پر وہ "الندوہ" کی ادارت کے دوران ہی پورے ملک میں مشہور ہو چکے تھے۔ لیکن "الہلال" چونکہ خوابیدہ قوم کو بیدار کرنے کا منظّم لائحہ عمل تھا، اس لئے "الہلال" میں مولانا کی شخصیت ایک صحافی و ادیب کے ساتھ ایک عالم دین اور رہنمائے قوم کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

جہاں تک مولانا آزاؔد کی صحافت کا تعلق ہے۔ اس سلسلے میں مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا صحافتی دور ہندوستانی سیاست کے انتشار و بحران کا دور عروج ہے۔ ان کی تحریروں سے اس دور کی تمام خصوصیات اس طرح واضح طور پر ہمارے سامنے آجاتی ہیں کہ اس وقت کے ہندوستان کی تاریخ بآسانی لکھی جاسکتی ہے۔ ان کے صحافتی ادوار کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے کہ ان کی صحافت کا پہلا دور خالص علمی و ادبی خدمات پر مبنی تھا۔ اس دور میں انہوں نے خود بھی اخبارات و رسائل جاری کئے اور دوسرے مالکوں کے اخباروں میں بھی مدیراور نائب مدیر کی حیثیت سے کام کیا۔ غرضیکہ وہ اس دور میں صحافت کی دنیا کے سبھی اسرار ورموز اور نشیب وفراز سے واقف ہو چکے تھے۔اس زمانے میں ان کے انداز فکر میں نمایاں تبدیلی رونما ہونے لگی تھی ۔سر سید احمد خان کے جدید افکار ،جمال الدین افغانی کی تحریک آزادی اور تقسیم بنگال کے انقلابیوں سے ملاقات نے مولانا کی صحافت کا رخ موڑ دیا اور ان کے خیالات وافکار میں مزید پختگی آچکی تھی۔

مولانا آزاؔد کی صحافت کا دور ثانی بالخصوص اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس دور میں انہوں نے باضابطہ طور پر عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔یہ دور ہندوستانی سیاست کے انتشار کا دور عروج تھا۔ چنانچہ برٹش گورنمنٹ کے مظالم اپنی انتہا کو پہنچ چکے تھے اور ہندوستانی عوام ذہنی وروحانی کرب سے کراہ رہی تھی۔اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی زندگی کا پس منظر کم و بیش وہی تھا جس کا نقشہ سر سید احمد خان نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد بنایا تھا۔ایسے حوصلہ شکن اور صبر شکن دور میں مولانا آزاؔد نے اپنا سیاسی ومذہبی پیغام عوام تک پہنچانے کے لئے "الہلال" جاری کیا۔ حکومت کے عتاب کا شکار ہوکر الہلال بند ہوگیا تو انہوں نے البلاغ جاری کر دیا۔اس طرح اپنی صحافت کے دور ثانی میں انہوں نے ملک و ملت اور معاشرے کی اصلاح کے ساتھ ہندوستان کے سیاسی مسائل اور اپنے مذہبی افکار و خیالات کی نشرواشاعت کی۔ درحقیقت مولانا آزاؔدزبردست عالم دین ،سیاسی مبصر اور عظیم دانشور تھے۔چنانچہ ان کاصحافتی انداز

ہندوستانی سیاست کی کروٹ کے ساتھ کروٹ بدلتا رہا کیونکہ ان کی نظر ماضی کے ساتھ گردوپیش پر بھی تھی اور مستقبل پر بھی وہ گہری نظر رکھتے تھے۔

مولانا آزاد نے صحافت کو کلاسک کا درجہ دے کر اسے بڑی عظمت اور بڑا وقار عطا کیا۔ ان کے اس فن کی جانب متوجہ ہونے سے اردو صحافت میں چار چاند لگ گئے۔ انہوں نے اپنی صحافت کے ذریعے نہ صرف قوم کی بیداری اور ملک و ملت کی اصلاح کا کام لیا بلکہ اردو زبان و ادب کی بھی خدمت کی اور اسے دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ وہ صحافت کو مقدس پیشہ اور انسانیت کے عظیم ترین مشن کی تکمیل کا ذریعہ تصور کرتے تھے۔ ان کے نزدیک اخبار کا مقصد قوم اور انسانیت کی خدمت ہے۔ وہ صحافت کی آزادی کے قائل تھے اور اس میں کسی قسم کی مصلحت پسندی اور سمجھوتے کو خطرناک سمجھتے تھے۔ نیز صحافت میں وہ حق بات کہنے پر زور دیتے تھے چاہے سننے والا کوئی نہ ہو۔ مولانا اخبار کو معیاری اور جدید ترین تکنیک سے مزین کرنا چاہتے تھے تاکہ قارئین کے ذوق صحیح کو تسکین پہنچے۔ وہ اخبار میں ذاتیات پر کیچڑ اچھالنے کو سستی شہرت سے تعبیر کرتے تھے۔ انہوں نے صحافت اور ادب کو ایک ہی زمرے میں شامل کرکے دیکھا۔ ان کے نزدیک ایک صحافی کی قدروقیمت کسی عالم و ادیب سے کم نہیں تھی۔

درحقیقت مولانا آزاد کی حیثیت میدان صحافت میں محض ایک صحافی کی نہیں بلکہ ایک عظیم رہنما کی ہے۔ انہوں نے صحافت میں عمدہ طباعت اور اعلیٰ مواد کا ایسا معیار قائم کیا کہ آج ۸۶ برس گذر جانے کے باوجود اردو صحافت ان معیاروں سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ انہوں نے وادیٔ صحافت میں قدم رکھ کر اس میں انقلاب برپا کردیا اوراپنے اخبارات کو سماج کا آئینہ دار بنا دیا ۔وہ اپنے صحافتی اصولوں پر مضبوطی سے کار بند رہے ۔انہوں نے اپنی صحافت کو قوم کی بیداری اور معاشرے کی اصلاح کے لئے وقف کر دیا اور اس کے ذریعے ''امربالمعروف اور نہی عن المنکر''کا کام لیا۔نیز مسلمانوں کی کمزوریوں ،غفلتوں اور مایوسیوں کو دور کرکے ان کی مذہبی اورسیاسی حالت میں حرکت پیدا کردی ۔اپنی صحافت کے ذریعے انہوں نے جدید ترین علوم کی اشاعت کی اور ہندوستانی عوام کی فکرو نظر میں تبدیلی پیدا کرنے کی کامیاب کوششیں کیں۔ انہوں نے ہندوستان کی اخبار نویسی اور مطبوعہ اشاعت کو جدید ترین تکنیک سے روشناس کرایا اور

اخبارات و رسائل کی ترقی کے لئے ایک بالکل نیا راستہ کھول دیا۔ آئندہ آنے والے اخبار نویسوں کے لئے ان کی صحافت مشعل راہ بن گئی۔

مولانا آزاد کے صحافتی نظریات کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اخبار کو تجارت اور سستی ناموری حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں بلکہ رائے عامہ کی تعمیر کا اہم وسیلہ تصور کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ صحافی پر قارئین کے متوازی دل و دماغ کے نشوونما کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ بد قسمتی سے آزادی کے بعد اردو صحافت کو درپیش صورتحال خصوصیت سے تکلیف دہ بھی ہے اور اس کی شاندار روایت کے خلاف بھی، کیونکہ آج مولانا آزاد جیسی جامع کمالات اور جامع صفات شخصیت ہی نہیں جن کے قلم سے پھوٹنے والے شراروں نے فرنگی سامراج کے خلاف فلیتے کا کام لیا، مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار بھی کیا اور اردو زبان کی نشرواشاعت بھی کی۔ دراصل آج کا اخبار نویس ادیب نہیں ہے اور آج کا ادیب صحافت سے دور ہوتا جارہا ہے۔ نتیجے کے طور پر ادب اور صحافت میں خلیج بڑھتی جارہی ہے۔ آج مسلم معاشرے کی معاشی و اخلاقی پستی کو مدنظر رکھ کر ان کے اجتماعی ذہن و فکر کی تشکیل کے لئے موجودہ اخبارات و رسائل کو مولانا آزاد کے قائم کردہ اصولوں کی اشد ضرورت ہے۔ اگر آج بھی ان کے صحافتی اصول وضوابط کو پیش نظر رکھ کر اخبارات و رسائل جاری کئے جائیں تو بلا شبہ وہ کامیابی کی منزلوں سے ہمکنار ہوں گے۔

مولانا آزاد کے ادبی نقطۂ نظر کا جائزہ لیتے ہوئے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنے شعور کی ابتدا ہی سے شعر گوئی شروع کردی تھی۔ بلا شبہ ان کے ذوق شعروسخن میں ان کے گھر کا ماحول اثر انداز تھا کیونکہ ان کے والد اور ان کے بڑے بھائی غلام یٰسین آہ بھی شاعر و ادیب تھے۔ چونکہ مولانا آزاد نے صرف بارہ تیرہ سال کی عمر میں شاعری کی تھی لہٰذا ان کے کلام میں شاعرانہ پختگی نہیں پائی جاتی تھی ۔انہوں نے پرانے ڈھرے پر چل کر اپنی شاعری کا آغاز کیا، جسے محض تفنن طبع ہی کہا جا سکتا ہے۔وہ شاعری کے دلفریب راستوں میں زیادہ نہیں الجھے اور بہت جلد نثر نگاری کی طرف مائل ہوکر رفتہ رفتہ شاعری سے دور ہوتے چلے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ انہیں قدرت نے دوسرے کاموں کے لئے منتخب کر لیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی شاعری خود انہی کے قائم کردہ معیار پر پوری نہیں اترتی لیکن اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ان کا

شعری ذوق بہت بلند اورانتہائی معیاری تھا۔

درحقیقت مولانا آزاد کے گہرے احساسات شاعرانہ تھے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ میر و غالب اور دیگر استاد شعراء کے سینکڑوں فارسی واردو اشعار ان کی زبان پر تھے۔ ان شعراء کا ہر اچھا اور قابل توجہ شعر نہ صرف مولانا کو زبانی یاد تھا بلکہ انہوں نے اپنی نثری تخلیقات میں ان اشعار کا جا بہ جا استعمال موقع و مناسبت کے لحاظ سے اس خوبصورتی سے کیا کہ ان کی نثر شعریت میں ڈوب کر ادب پارہ بن گئی اور ان میں شعر کی مہک اور لذت رچ بس گئی۔ غبار خاطر اس کی زندہ و جاوید مثال ہے۔ ان کے نثری حسن اور شاعرانہ نثر کو سبھی معتبر نقادوں نے خوب سراہا ہے۔ مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو مولانا آزاد ، بحیثیت شاعر تو کامیاب نہیں ہیں البتہ انہوں نے شاعرانہ مزاج ضرور پایا تھا اور ان کے شعری ذوق کا معیار بہت اونچا تھا۔

مولانا آزاد کی نثر نگاری سے متعلق یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے عہد کے سب سے نمایاں اور فعال ادیب تھے۔در اصل مولانا نے مقصد کے حصول کے لئے جمالیاتی اقدار کو قربان نہیں کیا اور جمالیاتی قدروں کی خاطر مقصدیت سے گریز نہیں کیا۔وہ اپنے عہد کے دیگر شعراء وادباء کی طرح اپنے خیالات کی پیچیدگی کو زبان کی سادگی سے سہل اور عام بنانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ زبان وبیان کی رنگینی کے ذریعے اہل مذاق کے لئے دلچسپی پیدا کر دیتے ہیں۔وہ حقیقی اور معیاری فن کے قائل تھے ۔ان کاخیال تھا کہ معیاری فن ہمیشہ حقیقی تعلیم کا مؤثر ذریعہ ہوتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے فلسفۂ ادب میں حق وباطل،عیب و صواب اور تاریکی وروشنی کے متوازن امتزاج ہی کو صحیح زاویہ قرار دیا۔ جو طرز نگارش انہوں نے اپنایا تھا وہ بالکل فطری تھا، اس میں تصنع برائے نام بھی نہیں تھا اور وہ طرز انہی کو زیب بھی دیتا تھا۔ انہوں نے مرزا غالب کی طرح اپنی انفرادیت قائم رکھی اور اپنی نثر نگاری میں عوامی اصولوں کی تقلید کو اپنے لئے باعث ننگ سمجھا۔ ان کی نثر نگاری کا یہ اسلوب تو انہی کے ساتھ ختم ہوگیا لیکن اس تاریخ ساز ہستی نے جو اپنا نثری ورثہ چھوڑا وہ ہماری علمی و ادبی اور فکری زندگی کے لئے گراں قدر تاریخی ورثہ ہے۔

مولانا آزاد کا ادبی نقطۂ نظر واضح تھا۔ وہ ادب کے ذریعے معاشرے کی اصلاح کرنا چاہتے تھے اور ساتھ ہی قارئین کے ذوق صحیح کو تسکین بھی پہنچانا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ادب

میں معیاری مضامین کے ساتھ دلچسپ اسلوب بیان اور پر تاثیر الفاظ قارئین کی دلچسپی کا موجب بنتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی تحریروں میں ان کی انانیت اور انفرادی شخصیت پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے جسے خال خال لوگوں نے ادبی نقص سے بھی تعبیر کیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا آزاد کی یہی انانیت و انفرادیت ان کے نثری ادب کی حسین ترین خصوصیت بن گئی اور واقعہ یہ ہے کہ اسی خصوصیت نے انہیں عوامی زندگی سے قریب تر کردیا اور وہ اپنے معاصر اہل قلم سے بلند و بالا اور ممتاز نظر آنے لگے۔ نیز ان کی تحریریں لافانی اور لاثانی بن گئیں جسے کوئی دوسرا تقلید کی گرفت میں نہیں لاسکا۔

مولانا آزاد کی عملی زندگی کی طرح ان کی ادبی شخصیت میں بھی دو مختلف رجحانات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کے دوسرے مشاغل کی طرح ادب میں بھی ایک مخصوص توازن قائم رکھا۔وہ فن برائے فن اور فن برائے زندگی کی بحث کو قطعی فضول سمجھتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ دونوں مقولوں کے بطن میں ایک ہی حقیقت مخفی ہے اور حقیقی فن افراد کے جذبات کی نمائندگی کرتا ہے،ان کے جذبات کو سنوارتا ہے اوران کے ادراک و تخیل کی تربیت بھی کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی خوددار انفرادیت ادب میں بھی اپنا وقار قائم رکھتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ مولانا آزاد ادبی روایات کے سرچشموں سے بھی فیض یاب ہوئے اور ساتھ ہی جدید سائنسی پیش رفت کے نتیجے میں جدّت پسندی کا بھی احترام کیا۔ان کی متضاد شخصیت نے ادب میں فن برائے فن اور فن برائے زندگی کے درمیان سے گزر کراپنا مخصوص راستہ بنایا اور اپنی تحریروں کے ذریعے ماضی کی تاریخ،حال کی غلطیوں نیز مستقبل کی پیش گوئی کی، جو آج مابعد جدیدیت کے روپ میں ہمارے ادب میں درخشندہ و تاباں ہے۔

مولانا آزاد نے اپنے آپ کو کبھی ادیب یا شاعر کی حیثیت سے پیش نہیں کیا۔لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ بنیادی طور پر ایک بلند قامت مفکر ہیں اور ادب ان کا آلہ کار ہے۔در حقیقت مولانا کو سیاسی مصروفیات نے اس طرح جکڑ رکھا تھا کہ وہ ادب کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دے سکے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر انہیں سیاسی سرگرمیوں سے یکسوئی حاصل ہو جاتی تووہ علم و ادب کے میدان میں بہت کام کر جاتے۔ ان کی سیاسی مصروفیات نے علم و ادب کا بڑا نقصان کیا، لیکن ان تمام مصروفیات سے دامن بچاکر انہوں نے جو کچھ لکھ دیا ہے

وہ ان کی فطرت اور نفسیات کا آئینہ دار ہے۔

مولانا آزادؔ نے خدمت خلق کی خاطر میدان کارزار سجانے سے بھی گریز نہیں کیا اور ہندوستان کی جد وجہد آزادی میں وہ اگلی صفوں میں نظر آئے۔ان کی یہ کاوشیں حصول آزادئ وطن تک قائم و دائم رہیں۔انہوں نے "الہلال" کے ذریعے مذہبی، اخلاقی، سیاسی اور قومی یکجہتی کے موضوعات پر قرآن و حدیث کے حوالوں کے ساتھ متعدد مضامین تحریر کئے اور مسلمانوں کو جنگ آزادی میں شرکت کی دعوت دی۔

مولانا آزادؔ اپنے عہد کے سب سے زیادہ وسیع النظر، کشادہ قلب اور انسان دوست رہنما تھے۔وہ صحیح معنوں میں ہندوستانی مسلمان تھے۔بالفاظ دیگر انہیں ہندوستانی اور مسلمان دونوں کہا جا سکتا ہے کیونکہ انہوں نے اسلام دوستی اور ملت پروری کے ساتھ وطن دوستی بھی نبھائی اور ملک کے باشندوں کی سماجی و معاشرتی فلاح اور آزادی کے لئے بھرپور کوششیں کیں۔وہ مساوات انسانی کے قائل تھے۔انہوں نے خالص قرآنی تعلیمات کی روشنی میں اخوت انسانی کے عالمگیر تصور سے جدید دنیا کو روشناس کرایا تھا اور اس حقیقت کا انکشاف کیا تھا کہ اعلیٰ تہذیبی اور انسانی قدریں کسی ایک قوم کی امانت نہیں ہیں بلکہ دنیا کی تمام متمدن اقوام نے اس میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔چنانچہ مشترکہ طور پر سبھی اس کے حقدار ہیں۔اسی تاریخی نقطہ نظر نے انہیں انسان دوست بنا دیا جسے ہم مولانا آزادؔ کے ہیومانزم سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

مولانا آزادؔ ہندستان کے پہلے رہنما ہیں جنہوں نے گاندھی جی سے بھی پہلے قومی یکجہتی کے تصور کو واضح کیا اور ہندو مسلم اتحاد کو بحال کرنے کی کوشش کی۔ان کی ان تمام کاوشوں میں کسی قیادت کی ہوس یا کسی ذاتی مفادات کے تحفظ کی فکر نہیں تھی بلکہ انہوں نے مخلصانہ طور پر بے لوث اور بے غرض ہو کر ملک وملّت کی خدمت انجام دی۔وہ اسے اپنا دینی فریضہ سمجھتے تھے۔ان کی خوبی یہ تھی کہ وہ بیک وقت انسان دوست اور وطن دوست دونوں تھے لیکن انسان دوستی کو سب سے اہم گردانتے تھے۔ان کی ساری زندگی ہندو مسلم اتحاد کا نمونہ تھی۔انہوں نے اس اتحاد کے لئے خود بھی جدوجہد کی اور ہندوستانیوں کو بھی اس کی ترغیب دلائی۔انہوں نے قومی یکجہتی کو آزادی پر بھی ترجیح دی۔وہ قومی یکجہتی کو متاعِ گراں بہا تصور کرتے تھے یہاں تک کہ اس کے بدلے میں انہیں ملک کی آزادی کو بھی ٹھکرا دینا منظور تھا۔ان کا خیال تھا کہ آزادی کھو

دینے سے صرف ایک ملک کا نقصان ہے لیکن قومی یکجہتی اور انسانیت کے فقدان سے پوری عالم انسانیت مجروح ہوتی ہے جسے مذہب کسی صورت میں روا نہیں رکھتا۔

مولانا آزاد فرقہ وارانہ اتحاد کو محض سیاسی ضرورت نہیں بلکہ مستقل انسانی ضرورت خیال کرتے تھے۔ وہ عام سیاستدانوں کی طرح قومی یکجہتی کو وقتی اور دفاعی ضرورت نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے خدا کا قانون سمجھتے تھے جس پر عمل کرنا ہر انسان کا فرض عین ہے۔ ان کا یہ پیغام دراصل پیام توحید تھا جس میں حریت اور اخوت انسانی کے عناصر پائے جاتے ہیں ۔انہوں نے اس پیغام توحید کے ذریعے عالمی انسانیت کی پر زور حمایت کی اور قومی یکجہتی کے تصور کو واضح کرتے ہوئے مسلمانوں کو بتایا کہ وطن و مقام، جنس ونسل اور رنگ وزبان سے انسانی تقسیم نہیں ہوتی ۔یہ حدود تو انسانوں کے قائم کردہ ہیں ۔چنانچہ ان حدود کو توڑ کر مسلمانوں کو دوسری قوموں کے ساتھ محبت ،اخوت اور بھائی چارگی سے پیش آنا چاہئے ۔اس طرح مولانا آزاد قومیت کو آفاقیت سے تعبیر کرتے ہیں اور اپنے قومی یکجہتی کے تصور کو وسیع عالمی تناظر میں دیکھتے ہیں۔

مولانا آزاد کا سیاسی نقطہ نظر سر تاسر اسلامی تعلیمات پر مبنی تھا۔وہ زندگی کے ہر شعبے پر دین کا اطلاق کرتے تھے اور اسی روشنی میں اپنے سیاسی طریقۂ کار کا تعین کرتے تھے۔وہ مذہب کو پولیٹیکل تعلیم کا ارفع و اعلیٰ ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ دوسروں کی سیاسی تعلیمات پر عمل کرنا غیر اسلامی ہے جسے اسلام کسی صورت میں روا نہیں رکھتا۔انہیں مذہب اسلام پر فخر ہے ۔ان کے نزدیک قرآنی تعلیمات کی روشنی میں سیاسی پالیسی اپنانے والے کو کسی ہندو پولیٹیکل گروہ کی حاجت نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے قرآنی تعلیمات کی بنیاد پر اپنے سیاسی اصول متعین کئے اور انہی اصولوں کی روشنی میں انہوں نے متحدہ قومیت ،سیکولرازم اور جمہوریت کے تصور کو واضح کیا۔ ملک وقوم کی بیداری کے لئے انہوں نے یہی راہ اپنائی اور مذہب وسیاست کے حسین امتزاج کی مثال دنیا کے سامنے پیش کی۔ انہوں نے مذہبی معاملات کی طرح سیاست میں بھی اعتدال و توازن کی راہ اختیار کی اور قومی نظریات پر عمل پیرا ہوئے ۔ان کی یہی خصوصیت انہیں ان کے ہم عصر سیاسی مفکرین سے جدا کر دیتی ہے اور وہ عظیم سیاسی رہنما کی صورت میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

مولانا آزاد عظیم دانشور اور سیاسی مبصر تھے ۔انہوں نے اپنی باریک بین سیاسی بصیرت

اور ژرف نگاہی سے وادیٔ سیاست میں داخل ہونے سے پہلے ہی انگریزوں کی "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی کو بخوبی سمجھ لیا تھا۔چنانچہ انہوں نے "الہلال" کی بصیرت افروز تحریروں کے ذریعے صرف تین سال کے اندر ہی مسلمانوں کی مذہبی اور سیاسی حالت میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا کر دی ۔اپنی سیاسی بصیرت سے انہوں نے کانگریسی رہنماؤں کے کئی اختلافات کو دور کر کے ان میں مفاہمت کروائی ۔ہندوستانی سیاست میں ان کے سیاسی تدبر و تعقل نے حیرت انگیز کارنامے انجام دئے ۔صرف پینتیس سال کی عمر میں وہ کانگریس کے صدر بنے۔ یہ انتخاب ان کی غیر معمولی دانشوری ، فہم و فراست اور سیاسی بصیرت پر دلالت ہے ۔یہ ان کی سیاسی بصیرت ہی کا کرشمہ تھا کہ برطانوی حکومت لرزہ براندام ہو گئی اور اس کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان نے فرنگی تسلط سے آزادی تو حاصل کر لی لیکن بد قسمتی سے اس نے اپنی وحدت کھو دی ۔یہ صحیح ہے کہ مولانا آزاد نے ملک کے انتہائی نازک دور میں عہدۂ صدارت کو چھوڑ کر بہت بڑی سیاسی غلطی کی تھی ۔لیکن اس ہمالیائی غلطی سے قطع نظر یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ وہ اس تقسیم سے دل برداشتہ ہوگئے اور ان کے خوابوں کا شیش محل ٹوٹ کر چکنا چور ہو گیا اور بادل ناخواستہ انہیں وہ سب کچھ دیکھنا پڑا جو وہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے ۔

مولانا آزاد کی غیر معمولی سیاسی بصیرت کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے کسی قوم پرست اور فرقہ پرست کی مزاحمت، ملامت اور مخالفت کی پرواہ کئے بغیر کانگرس کے اندر رہ کر اس کی قیادت سے بھی بلند ترین سطح سے آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے استقلال کے لئے صحیح بات آخر تک پورے زورو شور سے کہتے رہے ۔اس سلسلے میں انہوں نے گاندھی جی،جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل وغیرہ سے بھی مقابلہ کیا ۔وہ انتہائی کشادہ دل اور اولوالعزم انسان تھے ۔ملک کی تقسیم کے بعد بھی وہ مسلمان کی فلاح وبہبود کے لئے کوشاں رہے ۔جدید ہندوستان کی تعمیر وتشکیل میں ان کے تدبر اور سیاسی فہم وفراست کو بہت دخل ہے ۔انہوں نے ملک کی تقسیم کے بعد جو پیشین گوئیاں کی تھیں وہ آج حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوتی نظر آ رہی ہیں۔

یہاں افسوس کے ساتھ یہ ضرور کہنا پڑتا ہے کہ مولانا آزاد نے بیداریٔ قوم کے لئے آزادی سے پہلے جس ولولہ اور جوش اشتیاق کا مظاہرہ کیا تھا وہ آزادی کے بعد قائم نہ رہ سکا۔ ملک کی تقسیم کے بعد وہ کسی حد تک مایوس اور مضمحل نظر آنے لگے۔ان کی غیر معمولی سیاسی

بصیرت جو قطرہ میں دجلہ دیکھ لیتی تھی،وہ یہ محسوس نہ کر سکی کہ ایسے کمیونل ذہنیت اور رجحانات رکھنے والے سیاسی رہنماؤں کے ہندوستان میں پچاس برس بعد مسلمانوں کی حالت بد سے بدترین ہو جائے گی۔ اگر مولانا آزاد نے اپنی غیر معمولی سیاسی بصیرت اور فہم وفراست کو بروئے کار لاکر آزادی کے بعد صرف حقیقی پیشین گوئیوں اور قابل قدر تعلیمی اقدامات کے علاوہ عملی طور پر ہندوستانی سیاست میں مسلمان اور اقلیتوں کے حقوق وتحفظ کے لئے کوئی مؤثراقدام کر لیا ہوتا تو شاید آج مسلمانوں کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالت اس قدر ابتر نہ ہوتی اور مسلمان آج کے متعصّب ہندوستان میں دوسری قوموں کے مقابلے میں اس قدر بے بس اور لاچار ہو کر نہ رہ جاتے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس تشویش ناک صورتحال کی ذمہ داری خود مسلمانوں کی بے حسی ،کم علمی اور بد اخلاقی پر بھی عائد ہوتی ہے لیکن بحیثیت قومی رہنما، مولانا آزاد وہ بھی نہ کر سکے جو باباصاحب امبیڈکرنے اپنی قوم کے تحفظ کے لئے کر دکھایا۔بظاہر اس کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ مولانا آزادکے ساتھ سر سید احمد خان کی طرح ان کی تحریک کو تقویت اور استحکام بخشنے والی دانشور جماعت نہیں تھی ۔مولانا اپنی فطری افتاد طبع کی وجہ سے ہمیشہ تنہا ہی رہے اوراپنے وطن میں رہ کر بھی انہوں نے غریب الوطنی کی زندگی گزاری ۔

مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو آزادی سے کچھ پہلے اور آزادی کے بعد ہندوستان کے سیاسی حالات نے کچھ اس طرح کروٹ بدلی کہ حالات مولانا آزادکی دسترس سے باہر ہوگئے اور وہ بے بس اور لاچار ہو کر رہ گئے۔ ان تمام باتوں سے قطع نظر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ وہ ایک عظیم انسان ہونے کے ساتھ انتہائی دور اندیش، وسیع النظر، کشادہ قلب اور غیر معمولی سیاسی بصیرت کے مالک تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ہندوستان کے متعصب رہنماؤں نے ان کا ساتھ نہیں دیا لیکن ان کا تشکیل کردہ سیاسی نصب العین آج بھی ملک وقوم کے لئے مشعل راہ ہے۔ ان کا سیکولر اور آفاقی سیاسی نقطہ نظر آج بھی ہندوستان کے بے شمار مسائل حل کر سکتا ہے ۔ان کے سیاسی نظریات آج بھی بر صغیر کے مسلمانوں اور ابن الوقت سیاسی رہنماؤں کو دعوت غورو فکر دے رہے ہیں۔

مولانا آزاد بنیادی طور پر ایک بلند پایہ مفکر اور جیدّعالم دین تھے۔وہ کئی لحاظ سے منفرد اور اپنی مثال آپ تھے۔ انہیں صرف سیاستدان سمجھنا صحیح نہیں ہے ۔ان کی ذات میں علم و عرفان کی

ایک وسیع دنیا آباد تھی۔وہ ایک ایسے عالم دین تھے جنہوں نے شریعت پر کار بند رہتے ہوئے انبیاء و رسل کے مشن کی تعمیل کی ۔انہوں نے عبادت کے ساتھ انسانی زندگی کے عام معاملات میں بھی رہنمائی کی اور اپنے اخلاقیات کو سیاسیات تک لے جاکر ملک کی جدو جہد آزادی میں جہاد کیاجس کا ثبوت "ترجمان القرآن"اور "الہلال"کی تحریریں ہیں ۔ان تحریروں کے ذریعے انہوں نے انسانی زندگی کے تمام تر فطری پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے اور معاشرے کی اصلاح کے لئے حتی المقدور کامیاب کوششیں کی ہیں، جس سے ہر کس وناکس عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے لئے وہ اسی طرح کوشاں رہے جس طرح معاشرے کی اصلاح اور قومی یکجہتی کے لئے۔

"حزب اللہ"کی اسلامی جمعیت کو خیر باد کہہ کر مولانا آزادؔ کانگرس پارٹی میں شامل ہوئے۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ کانگرس اس زمانے میں قوم کے تحفظ کے علاوہ تحریک آزادی کے لئے سب سے فعال تنظیم تھی اور اس کی حکمت عملی مولانا کے نزدیک دین وایمان کے اعتبار سے مانع نہیں تھی۔ وہ زبردست عالم دین تو تھے ہی، کانگرس میں شامل ہوکر ایک مکمل سیاستدان کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آگئے۔مولانا کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے دینی علوم اور سیاست کے حسین امتزاج کی مثال قائم کر دی۔ مذہب اور سیاست کے متوازن باہمی اشتراک نے انہیں "امام الہند" بنا دیا۔ بحیثیت عالم دین مولانا آزادؔ کی امامت محدود نہیں تھی بلکہ اس میں ہمہ گیریت تھی، جس نے تمام عالمی برادری کو دائرۂ انسانیت میں سمو لیا۔انہوں نے بغیر کسی تعصب و تنگ نظری کے اپنی تمام تر بے لوث اور بے غرض خدمات ملک وملت کے لئے وقف کر دیں، غلامی کو ذلت قرار دیتے ہوئے تشکیک و تذبذب کو چھوڑ کرایمان ویقین کا راستہ اپنانے پر زور دیا۔ اپنی تحریروں ، تقریروں اورسرگرمیوں سے انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ بجا طور پر ایک جید عالم دین تھے ۔

مولانا آزادؔ نے ترجمان القرآن میں قدیم وجدید دونوں علوم سے استفادہ کرکے اسے شاہکار بنا دیا۔اس کتاب کے ذریعے انہوں نے بلا امتیاز مذہب وملت سب کو مخاطب کیا ۔قرآن فہمی کو عام کرنے کے لئے انہوں نے اس کتاب میں سادہ اور پر اثر اسلوب بیان سے کام لیا لیکن بدقسمتی سے یہ کتاب تعصب کا شکار ہوکر ایک محدود طبقے سے آگے نہیں جا سکی ۔بظاہر اس کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ ترجمان القرآن کی زبان اردو تھی جس سے ہندوستانی اکثریت نابلد تھی۔

دوسری طرف اردو خواں مسلمانوں میں سے بیشتر لوگوں نے اس کی دعوت کو شاید اس لئے قابل اعتنا نہ سمجھا کہ داعی مولانا آزاد تھے جو ایک خاص سیاسی طرز فکر رکھتے تھے جس سے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد نے اس وقت تک اختلاف کیا، جب تک کہ حالات نے اس کی صداقت کو ان پر آشکار نہ کر دیا۔

در حقیقت اسلامی دنیا میں پچھلی کئی صدیوں سے اجتہاد کی راہ مسدود ہو گئی تھی۔اس دور میں تلاش و تحقیق اور اجتہاد و تجدید یکسر مفقود نظر آتی ہے۔تمام عربی مدارس اور دینی تعلیم کے مراکز جدید تحقیقات علمی سے نا واقفیت کی بنا پر جدید عصری مسائل کو سمجھنے سے قاصر تھے۔مولانا آزاد کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کے بنیادی عقائد کو جدید تناظر میں سمجھنے کی روایت ڈالی۔ان کے جدید طرز فکر نے عقائد کو مجروح نہیں کیا بلکہ اسے مزید نکھارا اور قرآن کی حقیقی تعلیم سے جدید دنیا کو روشناس کرایا۔آج ترجمان القرآن کی تعلیم دماغ کو قائل کرنے کے ساتھ دلوں پر اپنا گہرا تاثر چھوڑتی ہے اور اصلاح کا ایک نقطہ آغاز فراہم کرتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا آزاد کو قرآن سے بے حد شغف تھااور وہ مسلسل ستائیس برس تک اسی پر تدبرو تعقل فرماتے رہے۔ مختلف ادیان کا تقابلی مطالعہ کر کے مسلمہ عقائد کی روشنی میں انہوں نے ثابت کیا کہ دین ایک ہی ہے۔ جس کی دعوت قرآن حکیم دے رہا ہے۔ تاریخ اقوام عالم کے ساتھ وہ سائنس کے جدید انکشافات و اختراعات سے بھی باخبر تھے۔ سورۂ فاتحہ کو انہوں نے فی الحقیقت "ام القرآن" ثابت کر دیا۔ انہوں نے ربوبیت، رحمت اور عدالت کے فلسفے کو انتہائی غور و فکر کرکے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ ترجمان القرآن کے ذریعے انہوں نے پہلی بار ترجمہ و تفسیر کے اصول مرتب کرنے کی کوشش کی۔ اس کتاب کا مقصد دور جدید میں اسلام کی ترجمانی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اسلام کو، اس کی اصلیت کے مطابق کسی رسمی دھرم کے بجائے ایک عام نظریۂ زندگی اور بہترین نظام حیات کے طور پر پیش کیا اور اس کے ذریعے عصر حاضر کے ہندوستان میں عالم انسانیت کی بنیادی خدمت کی۔ یہی چیز انہیں دوسرے مفکرین اسلام سے منفرد اور ممتاز کر دیتی ہے۔

مولانا آزاد کے ترجمان القرآن پر متعدد علماء کی جانب سے بہت سے اعتراضات بھی ہوئے۔ مثال کے طور پر ابتداء میں وہ اسرائیلیات سے بیزار نظر آتے ہیں اور انہیں قرآن میں

اسرائیلیات کے دخیل ہونے پر اعتراض بھی ہے لیکن بعد میں انہوں نے خود اسرائیلیات کا سہارا لے کر اصحاب کہف کی تعداد مقرر کرنے کی کوشش کی اور ان کے نام بھی درج کیئے۔ بیشتر علماء کو مولانا سے یہ شکایت تھی کی انہوں نے اس کتاب میں وحدت دین کا نظریہ پیش کیا۔مولانا آزاد نے ان تمام اعتراضات کے جواب میں انکساری کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے بلکہ انہوں نے اپنے فہم کے مطابق قرآن کی سادہ، فطری اور حقیقی تعلیم کو اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ترجمان القرآن پر علماء کی جانب سے کیئے گئے مختلف اعتراضات کے باوجود اس میں بھی شک نہیں کہ انہوں نے اس دور میں قرآن حکیم کی تعلیمات کی جو نئی روح پھونکی وہ کوئی دوسرا نہیں کر سکا۔

مولانا آزاد کے مذہبی نظریات کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے زندگی کے ہر شعبے میں اور ہر سرگرمی میں قرآنی تعلیمات کو پیش نظر رکھا اور اس پر سختی سے عمل پیرا ہوگئے۔ اسی روشنی میں انہوں نے صداقت کی راہ دکھائی جس کی تلاش میں ان کی روح بے چین اور مضطرب تھی۔ ان کی قرآنی بصیرت دیگر علماء کی طرح محدود نہیں ہے۔انہوں نے اپنے خاندانی علم و فضل کی بنیاد پر اپنے مذہبی نظریات کی جدید عمارت تیار کر دی اور اپنے لئے ایک ایسی شاہراہ بنائی جس نے انہیں ہندوستان کے دیگر علماء سے منفرد اور ممتاز کر دیا۔ان کی شخصیت کا مذہبی اور علمی پہلو ہی ان کی انفرادیت کا سب سے وزنی عنصر ہے۔وہ اپنے اجتہاد کے مقابلے میں اہل مذہب کے رائج الوقت توہمات اور اختلافات کو گمراہیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ نظام کائنات کے تغیر وتبدل کے ساتھ انسانی زندگی اور طرز فکر کو بھی تبدیل ہونا چاہیئے۔وہ دین اور دنیا کو الگ الگ خانوں میں تقسیم نہیں کرتے اور ساتھ ہی اس نکتے پر بھی زور دیتے ہیں کہ دین کی تبلیغ اہل اسلام کا مذہبی فریضہ ہے۔اس لئے اہل دنیا کے سامنے اہل اسلام کا فطری و قابل قبول نظام زندگی ترتیب دینا چاہیئے جو اسلامی تعلیمات کا اساسی پہلو ہے۔ چنانچہ انہوں نے مذہبی علماء کی خالص قدامت پرستی اور جدّت پسندوں کی خالص عقلیت پرستی کے درمیان سے گزر کر اپنا راستہ بنایا اور دو انتہا پسندیوں کے درمیان اعتدال و توازن کی راہ اپنائی۔

مولانا آزاد تقلید کے مخالف اور اجتہاد کے حامی تھے۔ان کا خیال تھا کہ کسی بھی قوم کو اپنی تاریخ اور ماضی سے رشتہ منقطع نہیں کرنا چاہیئے لیکن ساتھ ہی وہ اس بات پر بھی زور دیتے

تھے کہ ماضی کے غلط احترام سے قوموں کی فطری ترقی رک جاتی ہے، جب کہ قرآن مجید کی اصل تعلیم زندگی کی ترقیوں کو روکتی نہیں بلکہ اسے مزید متحرک کر دیتی ہے۔ نیز عہد جدید کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت بھی اس میں موجود ہے ۔وہ اسی حقیقت کو مسلمانوں کے ذہن نشین کرانا چاہتے تھے۔وہ مسلمانوں کو سر تاپا عمل دیکھنا چاہتے تھے۔ان کا اصرار تھا کہ خوف شک اور تذبذب سے انسانوں کو بچنا چاہئے اور قرآن کی روحانی حقیقت کو سمجھنا چاہئے تاکہ وہ اپنی زندگیوں کو بھی سنوار سکیں اور ملک وملت کی تعمیر وترقی میں بھی نمایاں خدمات انجام دے سکیں۔ ان کا پختہ عقیدہ تھا کہ قرآنی تعلیمات میں نہ صرف ملت اسلامی کی دینی ودنیوی فلاح مضمر ہے بلکہ تمام انسانوں، بشمول اہل ہند کے لئے فوز وفلاح اسی میں مستور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا آزاد نے تمام قومی ،ملی اور بین الاقوامی مسائل کا حل قرآن وسنت کی روشنی میں تلاش کیا۔ انہوں نے موروثی عقائد سے بیزاری،وحدت دین کی تشریح ،معاشرے کی اصلاح ،خدمت انسانیت اور ملک کی آزادی کے لئے جو تحریک چلائی ،اس کا سارا نقشہ اسلامی ہدایات کے مطابق ترتیب دیا اور قرآنی بصیرت کی روشنی میں اپنے کردارو عمل کی تشکیل وتعمیر کی ۔ان کے مذہبی نظریات آج بھی برصغیر کے مسلمانوں کو دعوت فکرو عمل دے رہے ہیں۔

آزادہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے مولانا آزاد نے تعلیم کا تفصیلی جائزہ لے کر منظّم تعلیمی منصوبہ بندی کی۔ اعلیٰ تعلیم اور ثانوی تعلیم کی بقاء و ترقی کے لئے انہوں نے سائنس ،ٹکنالوجی ،انگریزی،سماجی علوم،فنون لطیفہ وغیرہ کے کئی ادارے اور اکادمیاں قائم کیں۔ انہوں نے تعلیم نسواں اور تعلیم بالغاں پر خصوصی توجہ دی ۔اساتذہ کے مسائل پر انہوں نے سب سے پہلے آواز اٹھائی اور تعلیم کی تنظیم وتوسیع کے لئے بہت سے اقدامات کئے ۔تعلیمی درسگاہوں میں مذہبی تعلیم کے بجائے رواداری کی تعلیم پر زور دیا۔ نیز قدیم ورثوں کی حفاظت کے اقدامات کئے اور زبانوں کے تعلق سے ”سہ لسانی فارمولا“ پیش کیا۔

بحیثیت وزیر تعلیم مولانا آزاد نے ملکی مسائل کو بھی حل کیا۔ یہ انہی کی دانشوری کا کمال ہے کہ انہوں نے دنیاکی سب سے بڑی جمہوریت ہندوستان کو مخصوص ”سیکولرازم“ کا تصور دیا اور ملک میں اتحاد واتفاق برقرار رکھنے کے لئے قومی تعلیم کی پر زور حمایت کی۔ وہ بذریعہ تعلیم انسانوں کی اخلاقی، روحانی اور سماجی قدروں کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے قومی تعلیم

کے ذریعے بین الاقوامی اتحاد بحال کرنے کی کوشش کی اور عالمی تعلیمی تسلسل سے عالمگیر انسانیت کا رشتہ قائم کیا۔

مولانا آزاد کے تعلیمی نظریات کی بنیادی اصل یہ ہے کہ وہ مشرقی علوم کے ساتھ جدید مغربی فلسفے کو بھی اہم سمجھتے تھے۔ان کے نزدیک دونوں علوم کے اشتراک سے انسان سائنس کا صحیح استعمال سیکھ سکتا ہے اور اس کے ذریعے ان مقاصد کو حاصل کر سکتا ہے جو انسانی فطرت کے تقاضوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔انہوں نے اسی نظریۂ تعلیم کے ذریعے ہندوستان کے تعلیمی نظام کی تشکیل و تنظیم کے مسائل حل کئے اور اسے قومی رنگ و آہنگ عطا کیا۔ان کا تعلیمی تصور عالمگیر انسانیت کی طرف تھا۔

تعلیم سے متعلق مولانا آزاد کا تصور واضح تھا۔وہ مذہبی علوم کے ساتھ دنیوی علوم کو بھی ضروری قرار دیتے تھے اور اس کے ذریعے انسانوں کی فکر و نظر میں تبدیلی لانا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک تعلیم کا مقصد ایک مٹھی گیہوں اور ایک پیالہ چاول حاصل کرنا نہیں تھا بلکہ طلبہ کے ذہنوں کو بیدار کرنااور انہیں خود کفیل بنانا تھا۔ وہ تعلیم کے ذریعے لوگوں میں ذہنی بیداری ،اتحاد وترقی ،مذہبی رواداری اور بین الاقوامی بھائی چارگی دیکھنا چاہتے تھے۔

مولانا آزاد کی ذات مجسم علم تھی اور وہ وزیر تعلیم ہونے کے ساتھ ساتھ معلم اخلاق بھی تھے۔ان کے نزدیک مذہبی تعلیم کے ارفع وصالح تصور کو سامنے رکھنے سے کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا بشرطیکہ مذہبی تعلیم کا مقصد رواداری ،وسیع النظری اور انسان دوستی ہو۔انہوں نے رواداری کامفہوم واضح کرتے ہوئے بتایا تھا کہ ہمیں بدی اور بد کے فرق کو سمجھنا چاہئے۔ان کا خیال ہے کہ ہمیں برائی سے نفرت کرنا چاہئے ،نہ کہ برائی کرنے والے سے۔ٹھیک اسی طرح جیسے ڈاکٹر مرض دور کرنے کے لئے آپریشن کرتا ہے اور نشتر چلاتا ہے لیکن ساتھ ہی مریض سے ہمدردی بھی رکھتا ہے۔ان کے نزدیک یہ فعل عین مذہب کے مطابق ہے۔سائنس کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وہ خدا کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور اس کی جگہ لاارادی ہے ۔لہٰذا ایسی حالت میں اطمینان وتسکین کے لئے دین وحی کی مثبت آواز کی ضرورت ہے ۔اس طرح مولانا آزاد نے اسلامی فکر اور مشرق ومغرب کے فلسفے سے اپنا فلسفۂ حیات اختیار کیا تھا اور ملک کے لئے قدیم وجدید علوم کے حسین امتزاج کی پالیسی مرتب کی تھی۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ مولانا آزاد نے ملک کو جو تعلیمی پالیسی دی ،وہ ابھی تک ہندوستان میں ناخواندگی اور جہالت دور کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی لیکن اتنا ضرور ہوا کہ آج ہمارا ملک پوری دنیا میں چین اور جاپان کے بعد سائنسی تعلیم میں سب سے آگے ہے ۔اس تیز رفتار تعلیمی ترقی میں بلا شبہہ مولانا آزاد کی گراں قدر تعلیمی رہنمائی اور کار فرمائی شامل ہے ۔در اصل انہوں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنی فکر کا نقش تعلیم وتربیت کے ہر پہلو پر ثبت کر دیا ۔ان کی گہری سوجھ بوجھ، فہم و فراست اور کدو کاوش سے نہ صرف تعلیمی اداروں کی ہمہ جہت توسیع ہوئی بلکہ ان کی قابل قدر رہنمائی کی وجہ سے ملک کے نہایت اہم اور نازک موڑ پر ہماری تعلیم اور کلچر کا تصور مسخ ہونے کے بجائے مزید منور اور تابناک ہو گیا۔

ہندوستان میں مولانا آزاد کے بعد ۱۹۸۶ء میں جو نئی قومی تعلیمی پالیسی ترتیب دی گئی، اس کے ہر پہلو پر مولانا کے تعلیمی نظریات وفلسفہ کا عکس صاف جھلکتا نظر آتا ہے۔ آج ہمارے ملک نے تعلیم کے میدان میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے اور ریاستی سرکار اسے ترقی کی شاہراہ پر تیزی سے آگے بڑھا رہی ہے۔ اس تیز رفتار ترقی میں یقیناً مولانا آزاد کی قابل قدر تعلیمی رہنمائی کا بہت اہم رول ہے۔ یہ انتہائی مسرت کی بات ہے کہ ابھی حال ہی میں ۱۰، اگست ۱۹۹۸ء کو حیدر آباد میں منعقد انٹر نیشنل اردو کانفرنس میں "مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی" کے لئے دوسو ایکٹر زمین کا قبضہ مل چکا ہے۔ پروفیسر شمیم جے راجپوری کا خیال ہے کہ حاصل شدہ زمین پر بہت جلد چہاردیواری تعمیر کرادی جائے گی اور اس کے ساتھ ہی کیمپس کی تعمیر و ترقی کا منصوبہ بنایا جائے گا۔ موجودہ تعلیمی ترقی کو دیکھ کر بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ تعلیم کی دنیا میں آج جو چمک دمک ہمیں دکھائی دے رہی ہے، اس کی روشنی کا منبع اسی معمار اول امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا ذہن و دماغ ہے جس نے کافی غور وفکر کے بعد تعلیم کی تشکیل و تنظیم کی بنیاد کا پتھر رکھا جس پر آج تعلیم کی عمارت کھڑی ہے اور جگمگا رہی ہے۔

ان کا ناموں کو دیکھتے ہوئے اور مولانا آزاد کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہوئے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ تمام تر جدوجہد ان کی حمیت دینی کا نتیجہ تھی اور ان خدمات کے پس پردہ ان کا مقصود صرف بندگان خدا کو ان مصیبتوں اور پریشانیوں سے باہر نکالنا تھا جن میں وہ گھرے ہوئے تھے۔

مولانا آزاد کے یہی وہ عزیز کارنامے تھے جو انہوں نے بحسن و خوبی انجام دئے۔ ان کی علمی خدمات، ادبی سرمایہ، سیاسی قربانیاں اور مذہبی افکار و خیالات نے ان میں امتیازی خصوصیت پیدا کردی اور انہیں باوقار مقام عطا کیا۔ آج بھی ان کے ارفع و اعلیٰ نظریات ان کے پاکیزہ جذبات کی وجہ سے بہت بلند ہیں اور سیکولر ہندوستان کے لئے قابل تقلید، قابل تائید اور لائق صد ستائش ہیں۔